Dr. Samina Saif
Assistant Professor of Urdu, Government Graduate College for Women,
Samanabad, Lahore

ڈاکٹر ثمینہ سیف
اسسٹنٹ پروفیسر اُردو، گورنمنٹ گریجوایٹ کالج برائے خواتین،
سمن آباد، لاہور

”نو آئین ہندی“ ایک بے مثال داستان

"Nau Aieen-e-Hindi": An Exemplary Dastan

Abstract: In northern India, Mehr Chand Khatri Mehr transformed 'Nau Aieen e Hindi' into easy, simple, fluent and everyday language, by which he introduced such a style in narrative literature which was the best masterpiece of his creative writing. This story also serves as a base for modern Urdu prose. Mehr has used all the features of verbal narrative using technique of storytelling. Here we find that the story and characters are based on imagination and fantasy. The animal characters possess meanings of wisdom and self-discipline. Undoubtedly, Mehr formulated basic aspects of modern Urdu prose along with simple and fluent style of writing prior to the literature of Fort William College. However, this story remained unknown to the literary world, due to which it could not get the recognition it deserved. Syed Salman Hussain compiled this story and exposed it to the literary world.

Keywords: Mehr Chand Khatri, Fantasy, Animal, Characters, wisdom, Self-discipline, Fort William

دُنیا کی تمام ترقی یافتہ تہذیبیں اپنے ادبی ورثے کو نہ صرف زندہ رکھتی ہیں بلکہ وہ اسے مزید اجاگر کرنے اور بامعنی بنانے میں مصروف عمل رہتی ہیں جب کہ ہمارے ہاں الٹی گنگا بہہ رہی ہے، ہم نے اپنے قدیم ادب جو داستان کی صورت میں تھا اسے ناترقی یافتہ اور اوائلی کہہ کر کم تر معیار کا قرار دیتے ہوئے ماضی کا گم گشتہ اثاثہ قرار دے دیا ہے۔ ہمارے ہاں انگریزوں کے تسلط اور ۱۸۵۷ء کے بعد جو انقطاع پیدا ہوا اس کی بدولت ہم نے اپنے ادبی ورثے کو کم مایہ جانا۔ درحقیقت داستان ایک ایسا دلچسپ فکشن ہے جس میں داستان گویوں کے طرز گذاریوں میں اُردو ادب کے ماضی، حال اور مستقبل کے تمام ادب کی بنیادیں استوار ہیں، کہانی پن، تجسّس، مکالمہ، کرداروں کی حرکات اور منظر نگاری جیسے تمام عوامل عصر حاضر کے فکشن نگار کے لیے ایک ایسی زندہ کارگاہ ہے جس پر افسانہ، ناول اور ڈرامہ سمیت متعدد نثری و منظوم ادب کی عمارت کھڑی ہے۔ ہماری داستانوں کی روایت ایک ایسا اتھاہ کتھا ساگر ہے جس میں بیک وقت دو بڑے دھاروں کے سنگم ہیں، ایک دھارا عرب و عجم سے بہتا آرہا ہے اور دوسرا دھارا قدیم ہند کے سوتوں سے پھوٹا ہے۔ یوں یہ داستانیں پورب سے پچھم اور اتر سے دکن آتے آتے لامحدود تخیل، متنوع تہذیبوں اور عربی و عجمی علامتوں اور روایتوں سے گوندھی ہوئی ہیں۔ دکن کی نسبت شمالی ہند میں اُردو شاعری اور بالخصوص نثر کا فروغ بہت دیر سے ہوا۔ فورٹ ولیم کالج سے قبل اٹھارویں صدی میں شمالی ہند میں صرف دو قابل ذکر داستانیں ”نوطرز مرصع“ از تحسین اور ”نو آئین ہندی“ عرف ”قصہ ملک محمد و گیتی افروز“ لکھی گئیں۔

”نوطرز مرصع“ کا اسلوب پر تکلف ہے جہاں تشبیہ و استعارہ کی فراوانی اسے مزید مصنوعی بناتی ہے۔ درحقیقت تحسین نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہاں سلیس عبارت کے برعکس رنگین اور پر تصنع اسلوب کا چرچا تھا۔ پر تصنع، دقیق، پر تکلف اور مصنوعی اسلوب نے تحسین کی داستان کو غیر

متوازن اور فرسودہ بنا دیا ہے۔ اُردو زبان کے اسی ابتدائی دور میں "نوطرز مرصع" کے تقریباً انیس (۱۹) سال بعد مہر چند کھتری مہرؔ نے "قصہ ملک محمد وگیتی افروز" کو سلیس اور رواں زبان میں لکھتے ہوئے ایک نئی روایت کو جلا بخشی۔ مہر چند کھتری مہرؔ نے فارسی کے قصے آذر شاہ اور سمن رخ بانو کو ہندی میں ترجمہ کر کے "نو آئین ہندی" نام رکھتے ہوئے درحقیقت نوطرز مرصع کو ذہن میں رکھا ہو گا۔

"نو آئین ہندی" اٹھارویں صدی عیسوی کے آخر میں لکھی جانے والی داستان اپنی سلاست، سادہ بیانی اور عام فہم ہونے کی وجہ سے اُردو ادب کا بیش بہا سرمایہ ہے۔ سید سلیمان حسین نے اس داستان کو ۱۹۸۸ء میں مرتب کرتے ہوئے نہ صرف اسے دوبارہ حیات بخشی ہے بلکہ دیباچے میں تحقیقی و تنقیدی بصیرت سے کام لیتے ہوئے "نو آئین ہندی" کے مختلف مآخذ، داستان لکھنے کا سبب اور مہر چند کھتری مہرؔ کی حیات و شخصی حالات کا جائزہ لیا ہے۔ بلاشبہ سید سلیمان حسین نے عصر حاضر میں بے اعتنائی کی شکار اس داستان کو حیات نو بخشتے ہوئے داستانی ادب کے خزینے کو مزید ثمر آور بنایا ہے، نیز انھوں نے اس داستان کو نئے سرے سے مرتب کر کے یہ باور کروایا ہے کہ اُردو نثر کی سادگی اور اس کے وجود کے نکھار میں "نو آئین ہندی" بھی داد و تحسین کی مستحق ہے۔ درحقیقت یہ داستان ایک عرصہ تک گمنام رہی اور دُنیا اس ادبی تخلیق سے پوری طرح واقف نہ ہو پائی، اس داستان کو دُنیائے ادب سے روشناس کروانے کا سہرا سید سلیمان حسین کے سر سجتا ہے۔ یہ داستان شمالی ہند میں اُردو نثر کے تاریخی سفر میں ایک ایسی اہم منزل ہے جس نے اُردو کو اس وقت اُٹھایا جب وہ گھٹنوں کے بل چل رہی تھی اور فارسی کے طنطنے سے مرغوب تھی۔ "نو آئین ہندی" کو مہر چند کھتری مہرؔ نے مسٹر کیلی کی فرمائش پر ۱۸۰۳ء میں لکھا۔ مسٹر کیلی اُردو زبان سیکھنا چاہتے تھے، اس مقصد کے لیے مہرؔ کو ایک آسان اور سادہ زبان میں لکھی ہوئی کتاب کی ضرورت تھی، مگر ان کے سامنے صرف "نوطرز مرصع"، جیسی رنگین اور دقیق نثری کتاب موجود تھی جو اس کے لیے کار آمد نہ تھی۔ مہرؔ کی علمی استعداد بہت اچھی تھی لہٰذا اس نے مسٹر کیلی کے حکم سے یہ کام اپنے ذمّے لیتے ہوئے آذر شاہ و سمن رخ بانو کا قصہ "نو آئین ہندی" نام سے سادہ، رواں اور روز مرہ کی زبان میں لکھا تا کہ عوام الناس بھی اس کو پڑھ سکیں۔

قصے کا خلاصہ یوں ہے کہ کسی زمانے میں ہندوستان میں آذر شاہ نام کا بادشاہ حکمرانی کرتا تھا۔ اولاد کی نعمت سے محروم رہنے کی وجہ سے سلطنت سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے جنگل کا رخ کرتا ہے۔ وہاں اسے ایک درویش خبر دیتا ہے کہ شاہ ختن کی بیٹی سمن رخ سے شادی کرنے سے اس کے ہاں بیٹا پیدا ہو گا۔ بادشاہ درویش کی نصیحت مان لیتا ہے۔ سمن رخ حاملہ ہوئی تو بادشاہ کی پہلی بیوی زلالہ نے حسد کی آگ میں جلتے ہوئے ایک خاص پتھر سمن رخ کو پلایا، جس کے اثر سے وہ پاگل ہو گئی۔ اس کے علاج کے لیے قندھار سے درویش شیخ صنعان اور اس کے مریدوں کو بلوایا گیا۔ شیخ اپنے دو مریدوں دانا دل اور روشن ضمیر کو حکم دیتا ہے کہ وہ قصے سنا کر سمن رُخ کا دل بہلائیں، یوں نفسیاتی علاج سے وہ تندرست ہو جاتی ہے اور اس کا جنون جاتا رہتا ہے، زلالہ قتل کر دی جاتی ہے اور تمام سلطنت میں خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ شیخ کے سنائے گئے قصے میں ملک محمد اور گیتی افروز کے عشق کی داستان کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، جو کچھ یوں ہے کہ فرخندہ شاہ کے وزیر دانشمند کا بھتیجا ملک محمد سیاحت کا شوقین تھا۔ ایک دن وہ پھرتے ہوئے بابل پہنچا، جہاں پریوں کے بادشاہ عنصر شاہ کی بیٹی گیتی افروز اپنے باپ سے ناراض ہو کر کوہستان میں محل بنوا کر رہ رہی تھی۔ جو مرد اس کی طرف جاتا وہ اسے حیوان بنا دیتی تھی۔ ملک محمد افروز اس کے محل میں جاتا ہے اور اس پر دل و جان سے فریفتہ ہو جاتا ہے۔ گیتی افروز بھی ملک محمد کو دل دے بیٹھتی ہے۔ پری اسے محل میں تو رکھ لیتی ہے لیکن حدود بھی طے کرتی ہے اور اسے تنبیہ کرتی ہے کہ وہ اس کے ساتھ کوئی ناشائستہ حرکت نہیں کرے گا۔ مگر ملک محمد اپنی حدود پار کرتے ہوئے پری کا ہاتھ چوم لیتا ہے جس کے بعد سزا کے طور پر وہ کبوتر بنا دیا جاتا ہے۔ کسی طرح ملک محمد اپنے چچا دانشمند وزیر سے معجون کھا کر اصلی حالت میں آ جاتا ہے۔ مگر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ پھر پری کو ملنے چلے جاتا ہے۔ ملک محمد کو ہاتھ پاؤں چومنے کی اجازت مل جاتی ہے مگر وہ اضطراب

شوق میں محبوبہ کا منہ چوم لیتا ہے۔ جس کے بعد اسے اس جرم کی پاداش میں مرغابی بنا دیا جاتا ہے۔ ہزار جتن کے بعد وہ چچا دانشمند کے پاس لوٹ جاتا ہے اور انسان کی حالت میں واپس آجاتا ہے۔ چچا اسے آگاہ کرتا ہے کہ اب معجون ختم ہو چکی ہے۔ ملک محمد تیسری بار ناشائستہ حرکت کرنے کی وجہ سے بیل بن جاتا ہے اور چھ ماہ پانی بھرتا ہے۔ چچا اس کے لیے دوبارہ معجون تیار کرواتا ہے اور انسان کی حالت میں واپس لاتا ہے لیکن ملک محمد باز نہیں آتا اور چوتھی مرتبہ پری کے ہاتھوں کتا بن جاتا ہے۔ فرخندہ شاہ بھی ملک محمد کی خاطر ایک مرتبہ بلی بنتا ہے تو اسے دانشمند وزیر معجون کھلا کر انسان بناتا ہے۔ انسان بننے کے بعد فرخندہ شاہ فوراً ملک محمد کو قتل کرنے کا حکم دیتا ہے۔ پری کو جاسوس کے ذریعے جب اس واقعے کی اطلاع ہوتی ہے تو اس کے دِل میں محبت جوش مارتی ہے اور وہ بے قراری کے عالم میں ملک محمد کے پاس پہنچ جاتی ہے اور اسے وصل سے شاد کام کرتی ہے۔

''نو آئین ہندی'' میں داستان گو نے قصہ در قصہ کی تکنیک کو استعمال کرتے ہوئے کہانی کو آگے بڑھایا ہے اور اس میں دلچسپی پیدا کی ہے۔ داستان کا پلاٹ مربوط اور منضبط ہے۔ مختلف عنوانات کے تحت ۲۵ حصّوں پر مشتمل اس داستان میں ترتیب اس طرح رکھی گئی ہے کہ کسی حصے کی کمی بیشی سے تسلسل اور روانی جاتی رہے گی۔ بظاہر دیکھا جائے تو قصے پر قدیم داستانی ادب کا اثر موجود ہے، بادشاہ کا اولاد نہ ہونا، جنگل کو نکل جانا، درویش کا ملنا اور مراد بر لانا وغیرہ وغیرہ۔ نیز داستان کا طربیہ انجام بھی پرانی داستانوں سے اخذ کیا گیا ہے۔ دراصل ہر ادب اپنے عہد کے معتقدات اور تہذیبی وسماجی اثرات کا آئینہ دار ہوتا ہے، ہماری داستانیں بھی اپنے عہد کی تہذیبی تاریخ کا ارژنگ ہیں۔ مغلیہ تہذیب کا سورج غروب ہو چکا تھا اور عوام میں بھی عمل کی طاقت ماند پڑ گئی تھی تو اس صورت میں داستان عافیت کا ایک گوشہ فراہم کرتی تھی جس میں بہادری، مردانگی، شجاعت اور عشق کی شعلگی اطمینان بخشتی تھی۔ ویسے بھی داستانی ادب انسان کے اجتماعی شعور اور لاشعور کی پیداوار ہے تو ان حالات میں قصوں میں مماثلت آجانا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔

ہمارے داستان گوؤں نے کردار نگاری کی نسبت قصہ گوئی پر زیادہ توجہ دی ہے، اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ داستان ایک سمعی فن اور زبانی بیانیہ ہے اور یہاں قصے اور اسلوب کو اولیت دی جاتی ہے اور کردار نگاری کی حیثیت ثانوی رہ جاتی ہے، یہ داستان کا جوہر اور خوبی ہے نہ کہ اس کا عیب۔ ناول اور افسانے کے برعکس طوالت اور تکرار داستان کے زبانی بیانیے کی قوت ہیں اور اسی طرح طربیہ انجام بھی زبانی بیانیہ کی ایک صفت ہے۔ زبانی بیانیہ کو المیہ پہلو سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، داستان گو وہ باتیں ڈھونڈ کر لاتا ہے جس سے سامعین کو مسرت پہنچے اور وہ ایسی باتوں سے اجتناب کرتا ہے جس سے سامعین شاق گذریں۔ یونہی تمام داستانوں کی مانند ''نو آئین ہندی'' بھی ان تمام خصوصیات سے مالامال ہے جو کسی بھی زبانی بیانیہ کا خاصہ ہے۔

مہرؔ نے اپنی نثر میں شعریت پیدا کرنے کے لیے اشعار کا بھی سہارا لیا ہے۔ بعض اشعار تو ان کے اپنے ہیں جب کہ مثنوی ''سحر البیان'' سے بھی اقتباسات لیے گئے ہیں اور اپنے دور کے دوسرے شعرا کے بھی اشعار شامل کیے گئے ہیں۔ یوں انھوں نے نثر میں نظم کی چاشنی ملاتے ہوئے اپنے طرز نگارش کو جاذبیت عطا کی ہے۔ مثلاً ''نو آئین ہندی'' کی پہلی حکایت میں نظم اور نثر کو مہرؔ نے کچھ یوں گھلا ملا کر لکھا ہے:

''ایک روز آدھی رات کے وقت بادشاہ کے دل میں یہ خیال آیا کہ اتنی عمر میں نے یوں ہی غفلت میں کھوئی۔ میرے پیچھے کوئی ایسا نہیں کہ مالک مال اور وارث کا ہوگا اور اس زندگی کا ایک دم بھروسہ نہیں۔ نظم:

ہے زندگی حباب کے مانند یک نفس
کیا سیر میں جہاں کی کرے چشم وا کوئی
آب رواں کی طرح رواں ہے سدا یہ عمر
نازاں ہوا یہی زیست پر اے شہر کیا کوئی

اب یہی بہتر ہے کہ کسی جنگل میں جا کر باقی عمر حق تعالیٰ کی بندگی میں صرف کروں۔ یہ خیال کر کے اسی وقت تاج بادشاہی کا سر سے اتارا اور لباس گدائی کا پہن کے جنگل کی طرف روانہ ہوا۔ اور اپنے حال سے کسی کو خبر نہ کی۔"(۱)

درج بالا اقتباس "نو آئین ہندی" کے آغاز سے لیا گیا ہے جس میں مہرؔ کی زبان کی سادگی، روانی اور سلاست قابل تعریف ہے نیز اشعار کا استعمال بھی نہایت موزوں اور برمحل ہے جس سے شعری ادبیت پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ تحریر میں خلل واقع نہیں ہوا ہے۔ یونہی نثر میں نظم کے چٹخارے مہرؔ کی پوری داستان میں موجود ہیں۔

بلاشبہ شمالی ہند میں مہرؔ سے قبل کسی نے اس قدر آسان نثر تحریر نہیں کی تھی۔ ابتدا سے آخر تک کتاب انتہائی سنجیدگی سے بامحاورہ اسلوب کے تحت لکھی گئی ہے، مختصر جملے اسلوب کو مزید دلکش بناتے ہیں نیز یہ اسلوب عام و خاص دونوں کا نمائندہ ہے۔ گیان چند جین نے مہرؔ کے اسلوب میں جدت اور روانی موجود پاتے ہوئے "نو آئین ہندی" کو اپنے زمانے کی معیاری زبان قرار دیتے ہوئے یوں سراہا ہے:

"مہرؔ نے اٹھارویں صدی کے آخر میں وہ زباں لکھی ہے جو پون صدی بعد علی گڑھ تحریک کے زیر سایہ پروان چڑھی۔ جو آج سکہ رائج الوقت ہے۔ یقین نہیں آتا کہ مہر کو ایک صدی آگے کا روزمرہ سنائی دیتا تھا جس کے طفیل انھوں نے اپنا اسلوب انیسویں صدی یا بیسویں صدی کے مذاق کے مطابق ڈھالا۔ مہرؔ کا طرہ فخر بیانات کا وفور نہیں، انداز بیان کی سلاست ہے۔ ان کی زبان اگر کوثر و تسنیم سے نہیں تو آب زلال سے ضرور دھلی ہوئی ہے۔ سودا کے دیباچہ دیوان اور تحسین کی نو طرز مرصع کے بعد مہر کی نغز گوئی ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ اُردو انشا کے ارتقا میں فورٹ ولیم کالج کو جس طرح سلیس نثر کا بانی قرار دیا جاتا ہے اس کی داغ بیل مہر ڈال چکے تھے۔"(۲)

ڈاکٹر جمیل جالبی بھی مہر چند کھتری مہرؔ کے اسلوب کو سراہتے ہوئے ان الفاظ میں داد دیتے ہیں:

"اس کی نثر سادہ اور عام فہم اور اس طرز احساس کی ترجمان ہے جو جلد ہی آنے والے دور میں مقبول ہونے والا تھا۔ نثر میں جملے کی ساخت بھی بدل گئی ہے اور اس کے ساتھ لہجہ بھی بدل گیا ہے۔"(۳)

داستان میں کردار نگاری کے حوالے سے دیکھا جائے تو قصے کا ہیرو ملک محمد ایک سادہ لوح جواں ہے جس کی زندگی کا مقصد گیتی افروز کو پانا ہے۔ اپنے مقصد میں ظلم و ستم سہتا ہے اور آخر تک ہمت نہیں ہارتا ہے، وفاداری اور استقلال اس کردار کے تابناک پہلو ہیں۔ بسا اوقات قاری کو ملک محمد کی حالت پر ترس آتا ہے۔ ملک محمد کا کردار اپنے عہد کے شہزادوں کی عکاسی کرتا ہے۔ جس طرح چار مرتبہ جانور بننے کے بعد انسان کی حالت میں آنے کے لیے اسے چچا دانشمند وزیر کی مدد درکار ہے اور وہ اپنی حالت بدلنے میں نااہل ہے، ایسے ہی اٹھارویں صدی میں شہزادے تھے جن کی زندگی کا مقصد شباب کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہونا تھا۔ ملک محمد ہر مرتبہ اپنے لیے بیرونی مدد کا طلب گار ہوتا ہے، دراصل یہ کردار صحیح معنوں میں شاہ عالم، جہاندار شاہ اور سلیمان شکوہ کی علامتی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسرا اُردو میں عاشق کا تصور فارسی ادب سے آیا ہے، ایرانی عاشق تسلیم و رضا کا مرقع ہے جو محبوب کے حصول میں ذلت و خواری کو قابل فخر سمجھتا ہے، اسی لیے اُردو کا روایتی عاشق بھی انھی خصوصیات کا مالک ہے۔

داستان میں ملک محمد بالترتیب کبوتر، مرغابی، بیل اور کتا چار مرتبہ حیوان بنتا ہے۔ داستانوں میں انسانوں اور حیوانات کا بہت گہرا رشتہ ہے، انسان جنگل سے بھلے ہی نکل آیا ہو مگر اس کے ذہن سے جنگل کبھی نہیں نکلا۔ اسی لیے حیوانات کا ذکر دُنیا کی بڑی زبانوں کے ادب میں موجود رہا ہے۔ عربی میں الف لیلہ اور اخوان الصفا کے رسائل میں حیوانات کا ذکر موجود ہے۔ جب کہ فارسی میں انوار سہیلی، منطق الطیر اور گلستان و بوستان میں حیوانی

(ISSN: 2959-3735) جلد ۳، شمارہ ۱، جون ۲۰۲۴ء

کہانیاں موجود ہیں۔ ہندی ادب میں پنچ تنتر، کلیلہ دمنہ، مہابھارت، کتھا سرت ساگر اور ہتوپدیش جیسی داستانوں میں حیوانات کے ذریعے اصلاح اور حکمت آموز باتیں بیان کی گئی ہیں۔ اُردو ادب کی اولین منظوم داستان کدم راؤ اور پدم راؤ میں بھی حیوانات کی جھلکیاں موجود ہیں۔

داستانوں میں ان حیوانی کرداروں کی علامتی حیثیت اپنے اندر گہرے مفاہیم پوشیدہ رکھتی ہے۔ "نو آئین ہندی" میں ملک محمد چوتھی مرتبہ کتا بن جاتا ہے، درحقیقت کتا وفاداری کی علامت ہے۔ کتا بننے کے بعد گیتی افروز کو ملک محمد کی وفاداری، محبت اور استقلال پر یقین آتا ہے اور وہ پری ہونے کے باوجود ایک انسان کو اپنا لیتی ہے۔ داستانی متن ظاہری سطح پر جتنا سپاٹ نظر آتا ہے باطنی طور پر ہرگز ایسا نہیں، ان میں آنکھ سے زیادہ باطن سے مدد لیں تو وسیع امکانات اور نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ ہماری داستانوں میں جانوروں کی علامتیں اپنے اندر علم و حکمت کا قیمتی سرمایہ رکھتی ہیں۔ یہ حیوانی علامتیں اپنے وجود میں گہری رمزیں پوشیدہ رکھتی ہیں جن کی بنیاد پر علم نفسیات، سماجیات اور بشریات وغیرہ جدید علوم کی عمارت استوار ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سہیل احمد خاں نے یہ درست فرمایا ہے:

"داستان کی نسبتاً گہری سطحیں بھی ہیں اور داستانوں کے اعلیٰ مدارج بھی ہیں۔۔۔۔ رزم بزم کے مرقعوں، جنس کے چٹخاروں اور تخیل کی اڑانوں کا جائزہ لینے کے ساتھ اگر قصوں کی بنیادی سطح کو کھنگالا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان قصوں کا مجموعی انداز علامتی یا رمزی ہے۔ داستانوں کی تمثیلی استعاراتی یا علامتی سطح بھی ہے۔ اس سطح پر داستانیں حکمت اور تربیت نفس سے مربوط ہیں۔" (۴)

بلاشبہ داستانیں متخیلہ کا بہترین اظہار ہیں، یہاں تخیل طلسمانہ کا ہم نوا بن کر حیرت کا سامان پیدا کرتا ہے۔ "نو آئین ہندی" کے مصنف کے تخیل میں طلسمانہ کا بیان بھی موجود ہے۔ یہاں پری طلسم کے زور سے ملک محمد کو چار مرتبہ حیوان بناتی ہے۔ یہ طلسم اپنے اندر تربیت نفس اور خود احتسابی کا مظہر ہے، یہ داستانوں میں علم کا بڑا منبع اور ماخذ ہے اور اس کے بغیر داستان سپاٹ لگتی ہے۔

"نو آئین ہندی" عرف "قصہ ملک محمد و گیتی افروز" کا مرکزی اور واحد نسوانی کردار گیتی افروز ہے۔ گیتی افروز پریوں کے بادشاہ عنصر شاہ کی بیٹی ہے جو اپنے باپ سے ناراض ہو کر کوہستان میں ایک محل بنوا کر رہ رہی ہے، وہ مرد ذات سے اس قدر نفرت کرتی ہے کہ جو مرد اس کی طرف آتا ہے وہ اسے حیوان بنا دیتی ہے۔ یہ پری آخر میں اپنی جنس کے پری زاد منگیتر کو ٹھکرا کر ملک محمد کو ترجیح دیتی ہے۔ درحقیقت پری ہمارے اجتماعی لاشعور میں ایک نہایت حسین اور خوبصورت مخلوق تصور کی جاتی ہے، اس کے ساتھ عشق و محبت اور مباشرت و قربت کا تصور انسانوں کے اجتماعی لاشعور اور خوابوں میں ہمیشہ موجود رہا ہے۔ ایسا ہی تصور مہر چند کھتری مہرؔ نے گیتی افروز کے کردار میں پیش کیا ہے۔ گیتی افروز ایک فعال اور متحرک کردار ہے، داستان میں کہانی کا نیا رخ اسی کردار کی وجہ سے آتا ہے۔ وہ اپنے ارادوں میں مصمم اور مضبوط ہے، وہ ملک محمد کی محبت میں گرفتار ہونے کے باوجود چند حدود متعین کرتی ہے اور اسی پر سختی سے عمل پیرا بھی رہتی ہے۔

اٹھارویں اور انیسویں صدی کے سماج میں قصہ گوئی دل بہلانے کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ ان داستانوں کے محیر العقول قصوں میں غیر حقیقی کردار زندگی اور روزگار کی کشمکش سے آزاد دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن یہ کردار بدی اور نیکی کو پوری توانائی سے واضح کرتے ہیں۔ یہاں ہمیشہ خیر کو شر پر فتح ہوتی ہے اور ایسے ہی طربیہ انجام "نو آئین ہندی" کا دکھایا گیا ہے۔ آذر شاہ اور سمن رخ نیکی اور خیر کی علامت ہیں جب کہ زلالہ بدی اور شر کا استعارہ ہے۔ بلاشبہ داستانوں کی محبوبیت کا دلچسپ پہلو غیر فطری عناصر اور مافوق الفطری کردار ہی ہیں مگر ان میں کشاکش ہما ہمی اور اسرار و رموز کا منبع و محور انسان ہی ہوتا ہے اور چونکہ داستانیں طویل ہوتی ہیں وہ صرف جنوں، پریوں اور خواص کے اذکار پر نہیں چل سکتیں اس لیے عام انسانوں ان کے رسم و رواج کا آنا عین فطری ہے۔ لہٰذا دوسری داستانوں کی مانند مہرؔ کی داستان میں بھی ہندوستان کی عوامی زندگی کی جھلکیاں موجود ہیں۔

''نو آئین ہندی''میں اپنے عہد کی معاشرت اور طرز فکر کی عکاسی بڑی خوش اسلوبی سے کی گئی ہے۔ داستان میں شمالی ہند کی تہذیبی و مجلسی زندگی کی ایسی جھلکیاں موجود ہیں جس میں شاہی دربار کی شان و شکوہ اور وقار موجود ہے۔ داستان میں ضیافتوں اور اس کے اہتمام کے پس منظر شمالی ہند کا سماج ہی جلوہ گر ہے، یہاں درباری آداب، حفظِ مراتب اور جاگیردارانہ نظام میں اس عہد کے سماجی انداز فکر اور رجحانات کی تفصیل موجود ہے۔ داستان میں قصہ گوئی اور سراپا نگاری پر خاص توجہ صرف کی گئی ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ اُردو کی دوسری داستانوں کے برعکس یہاں سراپا نگاری یا جزئیات نگاری کے طویل نمونے موجود نہیں ہیں جس سے ایک تو داستان کی طوالت نہیں بڑھی اور دوسرا مبالغہ آمیز اور مسجع و مقفیٰ تحریر سے اجتناب برتا گیا اور یوں نثر کی فطری سادگی اور روانی مجروح نہیں ہوئی۔ مہرچند کھتری مہرؔ کی داستان ''نو آئین ہندی'' میں سید سلیمان حسین نے جزئیات نگاری کی کمی کو داستان کی دلکشی کا موجب جانتے ہوئے یہ بجا فرمایا ہے ''الغرض نو آئین ہندی میں قدیم داستانوں والا وہ تدریسی رجحان نہیں پایا جاتا جس میں معاشرت کے مختلف ساز و سامان یا کسی فن کی جملہ اصطلاحات کی فہرست سازی محض نمائش علم کے لیے کی جاتی تھی۔''(۵)

غرض یہ کہ ''نو آئین ہندی'' سے قبل کسی نے شعوری طور پر اس قدر سادہ اور آسان زبان تحریر نہیں کی تھی، مہرؔ نے ایسا سلیس، رواں اور دل نشین انداز ایجاد کیا جو اپنے عصری حالات سے بالکل ہٹ کر تھا اور وہ اس بات سے بالکل بے خبر تھا کہ اس کا یہ طرز اسلوب جلد ہی آنے والے دور میں مقبول و معروف ہونے والا ہے۔ بلاشبہ مہرچند کھتری مہرؔ نے ''نو آئین ہندی'' میں وہ زبان لکھی جو ۷۵ سال بعد علی گڑھ تحریک کے زیر سایہ پروان چڑھی نیز انھوں نے اس سادگی اور سلاست کی بنیاد رکھی جو بعد ازاں فورٹ ولیم کالج میں فروغ پائی۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں عربیت کا طلسم توڑنے کا سہرا میر امن کے سر نہیں بلکہ مہرچند کھتری مہرؔ کے سر سجتا ہے اور سادگی اور سلاست میں اولیت کا درجہ ''باغ و بہار'' کے بجائے ''نو آئین ہندی'' کا حق ہے۔

علاوہ ازیں قصہ ملک محمد و گیتی افروز کے تخیل میں علامتی معنویت اور طلسمانہ کے کارنامے بھی موجود ہیں۔ بلاشبہ یہ علامتیں اعلیٰ ذہنی تخیل کی غماز ہیں جو بڑی تہہ دار ہیں۔ جب قوموں کا ذہنی انحطاط ہوتا ہے تو وہ تخیل سے عاری ہوتے ہوئے علامتوں کا بڑا کمزور اور شکستہ نظام تخلیق کرتی ہیں۔ یہی حال عصر حاضر میں اُردو کی دیگر اصناف مثلاً ناول، افسانے اور غزل کا ہے، داستان کی علامتی حیثیت سے غفلت برتنے کی وجہ سے ہمارے ادیبوں کے ہاں زندہ اور جاندار علامتوں کا نہ صرف فقدان ہے بلکہ اِن میں بھرپور ابلاغ کی صلاحیت کی کمی ہے۔ اُردو میں جدید علامتی افسانے کے پیش رو انتظار حسین نے قدیم علامتوں سے دلبستگی کے سہارے تہذیبی روایتوں میں روحانیت اور اساطیر کو براہِ راست عصری زندگی سے ملا کر دیکھا ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ داستان ملک محمد و گیتی افروز سے انتظار حسین نے اپنی کہانی کا کایا کلپ کا بنیادی خیال اخذ کرتے ہوئے اُردو ادب کو ایک ایسا لازوال اور بے مثال افسانہ عطا کیا جس میں اساطیر اور مذہب کے ساتھ ساتھ ماضی و حال کا شعور اور لاشعور موجزن ہے۔

حوالہ جات

۱۔ مہرؔ، میرچند کھتری۔ نو آئین ہندی۔ مرتب: سید سلیمان حسین۔ لکھنو: اترپردیش اُردو اکیڈمی۔ اشاعت اوّل۔ ۱۹۹۴ء۔ ص ۵۷

۲۔ گیان چند۔ اُردو کی نثری داستانیں۔ کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان۔ اشاعت سوم۔ ۲۰۱۴ء۔ ص ۲۱۸

۳۔ جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اُردو (جلد دوم۔ حصہ دوم)۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ ۲۰۰۰ء۔ ص ۱۱۰۹

۴۔ سہیل احمد خاں، ڈاکٹر۔ داستانوں کی علامتی کائنات۔ لاہور: کلیہ علوم اسلامیہ و شرقیہ پنجاب یونیورسٹی۔ ۱۹۸۷ء۔ ص ۷

۵۔ مہرؔ، میرچند کھتری۔ نو آئین ہندی۔ مرتبہ: سید سلیمان حسین۔ ص ۲۲